موت سے پہلے

احمد علی

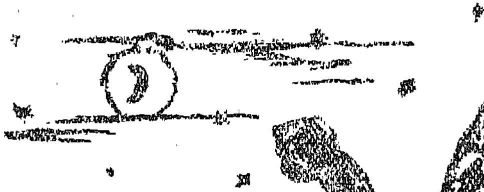
دہلی
انشا پریس
۱۹۱۹ کوچہ پنڈت
۱۹۴۵ء

موت سے پہلے

پہلی اشاعت

دسمبر ۱۹۳۵ء

دلی پرنٹنگ ورکس دہلی





وہیں اٹک جاتا ہوں۔
میری زندگی بہت تلخ تھی اور
میں دنیا کی نظروں میں خار
گزرتا تھا۔ جب کہ میں نکل
جائے گا تو نہیں باقی
رہے گی اور نہ درد کا احساس۔

ہر بدنما چہرہ آنکھوں کو بری معلوم ہوتی ہے۔ میری ہستی حسن کے چہرے پر ایک بدنما دھبہ تھی، اور میرے جانے کے بعد حسن کے دلدادہ اور عشاق بہت سی خوشیاں منائیں گے۔ ہر بوالہوس حسن کو حسن کا سودا تھا مجھ سے نفرت کرتا کیونکہ میں اس کے جاگتے پھول پر ایک پھوڑے کی طرح چپٹا ہوا تھا۔ ہر ایک اس کو دیکھ کر للچاتا لیکن میری

موجودگی کے سبب اس کو چھونے سے پرہیز کرتا کیسی بدصورت چیز کو جینے
کا حق نہیں۔ پر مجھے قضا و قدر پر کوئی اختیار نہ تھا حسن سے محبت
میں بھی کرتا تھا۔ جو سچ پوچھو تو مجھے بھی بدنمائی سے نفرت تھی لیکن
میں نہ تو اپنے جذبہ کو مار سکتا نہ اوروں ہی کو عشق کرنے سے روک
سکتا تھا۔ زندگی میری محبوبہ تھی اور میں اس کا دلسوز عاشق۔ مجھے
کیا پڑی تھی جو میں اوروں کی پرواہ کرتا! لیکن اب معلوم ہوا کہ میں
اس قدر بدصورت ہوں کہ حسن بھی مجھ سے نفرت کرتا تھا میری
زندگی ایک سراب تھی، ایسا رنگین خواب جو آنکھ کھلنے پر غیر حقیقی اور
بیکار ثابت ہو جاتا ہے۔ میں نے بدنمائی سے بھاگ کر حسن کی گود
میں پناہ لی تھی لیکن اب میرے خواب کی سب کڑیاں ٹوٹ
چکی ہیں اور میں پھر اسی صحرا میں کھڑا ہوں جس کا ہر گوشہ بھیانک ہے
اور ہر ذرہ دل خراش۔ پچھلے واقعات پھر دماغ میں تازے ہو چلے
ہیں۔ میرے دل کی جلن مجھ سے پھر کچھ کہنے آئی ہے . . .

میرے مکان کے احاطے میں ایک سوکھا ہوا درخت تھا نہ جانے کس بیماری کا مارا ہوا تھا۔ شاید اس کی جڑیں دیمک لگ گئی تھی اور لُو کے ایک تھپیڑے نے اس کو جلا دیا تھا۔ اب اُس کے صرف دو تنے باقی رہ گئے تھے اور ایک ربڑ کی غلیل کی طرح آسمان کی طرف نشانہ باندھے نظر آتے تھے۔ جب کبھی میں شام کو اس کی طرف نگاہ اُٹھا کے دیکھتا تو مجھے موت کے شکاری کا گمان پیدا ہو جاتا جو ایک خونخوار گولے سے آسمان کا شکار کرنے والا ہو۔ اور اکثر راتوں کو مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ شکاری میں ہی ہوں اور تاریکی کے ربڑ کو کھینچکر چھپے ہوئے سورج کا غلّہ تاروں کے جال پہ مار رہا ہوں۔ تاروں کا جال پھٹ جاتا اور کہکشاں کی چوڑی سڑک آسمانوں کو پار کرتی ہوئی ابد کی گہرائیوں میں کھو جاتی لیکن درخت ایک ازلی بیوقوف کی طرح دونوں ہاتھ لجلجے پن سے آسمان کی طرف پھیلائے اس طرح تکتا کہ مجھے اُس کی کُند ذہنی پر غصّہ آنے لگتا جیسے

کسی مستان پگلے کی احمقانہ حرکتوں پیدا ہو جاتا ہے اور میرا جی یہی
چاہتا کہ کلہاڑی لے کر اُسے ڈھا دوں۔ فضا کی لامتناہی وسعت
میں درخت کے دونوں کندھے ایک چھوٹے سے غار دار دہانے کی
طرح دکھائی دیتے جن کو وہ جیتے جاگتے گوشت میں بے رحمی سے گڑا ہوا
ہو اور جسم کا یہ تقاضا تھا کہ اُسے نوچ کر نکال پھینکے۔

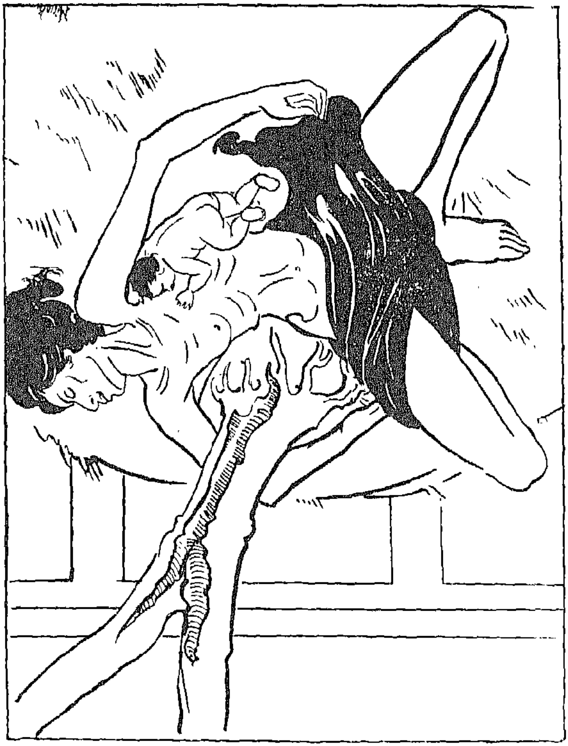
ایک مرتبہ کوئی قحط کی ماری لڑکی اُس کے نیچے آ پڑی تھی شاید
اُن دونوں میں کوئی ابدی رشتہ رہا ہو اور چونکہ دونوں کمزور تھے
اور بھوکے تھے وہ ایک دوسرے کی پناہ کے ہم آغوش ہو گئے تھے
صبح کو جب میں ادھر سے ٹہلتا ٹہلتا درخت کے پاس سے گزرا
تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سوکھی ہوئی عورت جس کے جسم پر صرف
چیتھڑا اور چمڑا رہ گیا تھا درخت کے نیچے مری پڑی ہے اور ایک
بچہ اُس کی چھاتیوں سے چمٹا مردہ تھن چوس رہا ہے۔ وہ اُن کو زور
زور سے کھینچتا اور بیل کی طرح چھوڑ دیتا تھا، اور جیسا وہ دھڑام

نکلتا، تو زمین پر پیر رگڑتا اور دھاڑیں مارنے لگتا۔ عورت کی
آنکھیں گڑھوں میں دھنس گئی تھیں، لیکن اس کے ہونٹوں پر
ایک ہنسی کھیلتے کھیلتے منجمد ہو کے رہ گئی تھی۔ اس کا جسم برہنہ تھا اور
اس کی سوکھی ہوئی کالی ٹانگیں درخت کے تنوں کی طرح چیری
ہوئی تھیں۔ اس کا سر درخت سے لگا ہوا تھا، اور اس کی ٹانگیں
درخت کے سائے کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ اس کی ڈراؤنی شکل
دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لیکن دو چیزیں مجھے پریشان
کرتی رہیں۔ ایک تو عورت کے چہرے پر ہنسی کی کیفیت، دوسرے
اس مرگئے بچے کا زور زور سے دودھ چوسنا۔ کیا موت زندگی پر
ہنس رہی تھی؟ یا زندگی موت سے حیات کی متلاشی تھی؟

شاید ایسا ہی رہا ہو۔

میرا دماغ تو ابھی تک دنیا کے دھندلکوں میں الجھا ہوا ہے
اور ایسا بھی جب کہ میری زندگی صرف کچھ دنوں کی رہ گئی ہے۔ میں

اُن کو نہیں چھوڑ سکتا۔ موت کے دیس میں نہ یہ مسرتیں ہوں گی اور نہ
یہ رنج جن کی وجہ سے جینے کا ہر لمحہ عزیز اور بیش بہا معلوم ہوتا ہے۔
زندگی کے میدان میں موت کا ساتھ ہی ہے موت کی وادی میں زندگی
کا گزر کہاں؟ اور میں اُن جذبات کو ترسوں گا جو زندگی میں سکونِ
قلبی کے دشمن اور ہوش و آگہی کے رہزن تھے۔ نہ وہاں یہ زندگی بخش
ہوائیں ہوں گی جن کا ہر ہر جھونکا مُردہ دلوں کو جلا دیتا ہے اور نہ
حسینوں کی یہ کافرادائیں جو ایمان و تمکنت چھین لیتی ہیں۔ نہ وہاں
کوّے ہوں گے جو ایک لمحہ اطمینان نہیں لینے دیتے اور نہ یہ چیل
و گدھ جو زندہ گوشت پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ جیسے جیسے میرا وقت
قریب آتا جاتا ہے ویسے ویسے دُنیا کی محبت بھی دل میں بڑھتی جاتی
ہے۔ لیکن پھر ہر بات سے کوفت ہونے لگتی ہے۔ میرا دل دُنیا کی چیزوں
سے متنفر ہو جاتا ہے۔ ہر شے بُری معلوم ہوتی ہے اور ہر کام بیہودہ اور عبث۔
جی چاہتا ہے کہ جتنی جلد اس بے سود رنج اور بے کار کوشش



سے نجات مل جائے جو وہ رد اور ناکامی کی منزل سے آگے نہیں بڑھتے اُتنی ہی جلد میں زمانہ کی مجبوریوں سے آزاد ہو جاؤں گا۔ ساری عمر گنوانے کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ تلاشِ حق ایک دھوکا ہے اور خواہشِ ایمان ایک بیکار ہوس۔ جو چیز کہ دل میں موجود ہو اُس کو ڈھونڈھنے سے کیا حاصل؟ جنگل جنگل صحرا صحرا اور پہاڑوں میں مارے مارے پھرنے سے کیا فائدہ؟ یا تو ہم اپنے ضمیر کی آواز سُننے سے قاصر ہیں یا اُس کو بھلانے کے لئے اپنے دماغوں کو اور بسا خیالوں سے پاک کرنے کی تمنائیں راندۂ درگاہ بنے پھرتے ہیں۔ یہ نہ اس کل چین آتا ہے نہ اس کروٹ آرام۔

میرے پاس ایک پادری صاحب آیا کرتے تھے اُن کا قد لمبا تھا، ہاتھ پاؤں بڑے بڑے تھے اور اُن کے لمبوترے چہرے پر اُن کی بڑی سی ناک اور نکیلی داڑھی ایک چٹان پر جھڑبیری کی جھاڑی کا گمان پیدا کر دیتی تھی۔ وہ اکثر دھوتی باندھتے تھے اور اُن کی

پتلی ٹانگیں اُٹھنگی دھوتی میں سے نکلی ہوئی دو لکڑیوں کی طرح نظر
آتی تھیں وہ لڑکھڑاتے ہوئے چلتے اور دیکھنے کو یہ شبہ ہوتا کہ اب گر جائیں گے
لیکن اُن کے پھاوڑا سے پیر اُن کے جسم کو سنبھالے رہتے جب بھی
وہ کرسی میں بیٹھتے تو ایک جلا ہوا سگریٹ منہ میں لگا کر سلگاتے اور زور
زور سے کش کھینچتے اور اُن کے منہ سے رال بہہ بہہ کر اُن کی داڑھی پر
ٹپکنے لگتی۔ جب باتیں کرتے کرتے وہ جوش میں آجاتے تو عجیب سی
جذبہ اُن پر کچھ اس طرح غالب آجاتا کہ وہ آنکھیں بند کر لیتے اور
سسکیاں لے لے کر انگریزی گیت گانے لگتے اور اُن کی آواز
ایک لوہار کی دھونکنی کی طرح تھراتی ہوئی سنائی دیتی اور اُن کے
سانس کا غراٹا ایٹموں کی پھنکار کی طرح کانوں میں آتا۔

وہ اکثر مذہبی مسائل پر بحث کیا کرتے۔ حالانکہ وہ ہندوستان
کے بہت قائل تھے، لیکن اسلام کے جمہوری مسئلے اُن کی سمجھ میں نہ
آسکے۔ وہ ہمیشہ اسی شبہ میں رہتے کہ ان مسئلوں کی آڑ میں ضرور

کوئی ٹھہراؤ نہیں ہے۔ آواگون کا ٹیڑھا مسئلہ ان کو دقیق نہ معلوم ہوتا لیکن
قبر کے عذاب کا بیان ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ روح القدس کی تجلیاں
وحی کے مقابلہ میں ان کو سہل معلوم ہوتی تھیں۔ ان کو یہ شکایت تھی
کہ جب اسلام میں اقتصادیات اور سیاسیات دونوں بیک وقت
دینیات کا ایک جزو ہیں تو ایسا مذہب آسمانی کیسے ہوا؟ اسے تو
ایک معاشرتی اور سیاسی نظام کہنا چاہیے۔ ان کی رائے میں کوئی
مذہب بغیر [illegible] کے مذہب کہلانے کا مستحق نہیں۔ اسی وجہ سے وہ
اسلام اور اشتراکیت میں تمیز نہ کر سکتے تھے۔ جو کچھ بھی فرق وہ مانتے
یا سمجھتے تھے وہ اتنا تھا کہ اگر اسلام اللہ کی ڈکٹیٹرشپ ہے تو اشتراکیت
اسٹالین کی۔ اور ان کو دونوں سے چڑ تھی۔

ایک رات میں کسی غیر معمولی وجہ سے خوش خوش بیٹھا ہوا
تھا کہ پادری صاحب آ نکلے۔ باتوں باتوں میں تثلیث کے مسئلہ پر
گفتگو ہونے لگی۔ میرے اندر لڑکپن کا شرارتی جذبہ عود کر آیا اور میں نے

کہا:

"آپ لوگوں نے تو ایک نہایت انسانی خیال کو اتنا روحانی اور پیچیدہ بنا دیا ہے۔"

پادری صاحب بولے:

"آپ کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

میں نے کہا:

"تثلیث سے آپ لوگ باپ اس کے بیٹے اور روح القدس سے مراد لیتے ہیں۔"

وہ بولے:

"تو اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"ہونے کو تو کچھ بھی نہیں اور بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

"تو کیا آپ کی رائے میں تثلیث کا کچھ اور مطلب بھی ہے؟"

"میں اتنی جرأت تو نہیں کر سکتا کہ آپ کو جھٹلاؤں۔ لیکن

آپ جانتے ہیں کہ دنیا کے سارے مذہب انسانی فہم اور تجربوں کو روحانی جامہ پہناتے ہیں۔ حضرت ابراہیم جس طرح خدا کے وجود کے قائل ہوئے اُس سے دماغ انسانی کی ترقی کا پتہ چلتا ہے اور جیسے جیسے انسان کی زندگی پیچیدہ ہوتی گئی مذاہب میں بھی گہرائی اور پیچیدگی پیدا ہونے لگی چنانچہ حاکموں اور عالموں نے ہر چیز کو آسمانی رنگ دینا شروع کر دیا تاکہ لوگ اُن سے بازپرس نہ کر سکیں عیسائیوں نے تثلیث کا مسئلہ اسی خیال کے تحت میں نکالا۔ جسے آپ باپ بیٹا اور روح القدس کہتے ہیں وہ دراصل خدا، انسان اور ضمیر ہیں۔ خدا کا اصلی بیٹا انسان ہے اور اس کا بھڑکانے والا شیطان . . .!"

میں ابھی بات پوری بھی نہ کرنے پایا تھا کہ پادری صاحب ایک جنون کی کیفیت میں کھڑے ہو کر پھنکارے بھرنے لگے۔ جھاگ بہہ بہہ کر اُن کی ڈاڑھی اور کپڑوں پر گر رہے تھے۔ اُن کی دھوتی کھل گئی اور بلیوں جیسی ٹانگیں میرے احاطے کے درخت کے سائے کی طرح

دکھائی دینے لگیں۔ پھر انھوں نے اپنے ہاتھ اس طرح آگے بڑھائے جیسے میرا گلا گھونٹنا چاہتے ہوں۔ ان کی لمبی لمبی انگلیاں کسی سوکھے ہوئے درخت کی بل کھائی شاخوں کی طرح دکھائی دینے لگیں۔

میں اسی پریشانی میں تھا کہ یکایک ہوائی حملے کا بھونپو بجنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ ہزاروں جہازوں کا شور اٹھا دور سے سنائی دیا اور بجلی گھر والوں نے روشنی گل کردی۔ روشنی کا بند ہونا تھا کہ گولے پھٹنے لگے۔ پادری صاحب ایک کرسی کی آڑ میں زمین سے چمٹ کر اس طرح لیٹ گئے جیسے مینڈک پانی کی سطح پر ہاتھ پیر پھیلا کے لیٹ جاتا ہے۔ میں بھی ایک کونے میں دبک گیا اور روح القدس کے جلا دینے والے نور اور خدا کے غضب سے سہم گیا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ گناہوں کی سزا دنیا ہی میں مل جاتی ہے.....

اس واقعہ کے بہت عرصہ بعد تک پادری صاحب سے میری ملاقات نہ ہوئی۔ ایک روز ٹہلتا ٹہلتا میں بہت دور نکل گیا۔

شام کا وہ وقت تھا جب موت زندگی پر آہستہ آہستہ قابو پاتی جاتی ہے اور رات کی تاریکی دن کا گلا گھونٹنے لگتی ہے۔ سامنے پہاڑیاں تھیں اور ایک سڑک بل کھاتی ہوئی نیچے میدان کی طرف آتی تھی۔ اس وقت ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، حتیٰ کہ کوّے بھی خاموش ہو گئے تھے۔ دن کو بارش ہوئی تھی اور پہاڑیوں کے پیچھے سرمئی آسمان پر ایک دھیمی زرد لکیر بادلوں کے بیچ میں جھلکتی دکھائی دیتی تھی۔ جابجا پانی کھڑا ہوا تھا اور اس میں پہاڑیوں، آسمان اور بادلوں کا تاریک پر دلکش عکس ایک عجیب روحانی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ ہوا کچھ اس طرح مست خرام تھی کہ میرا خون رگوں میں تیزی سے دورہ کرنے لگا اور میں دنیا سے بہت دور بے رنگ و بے تخیل خوابوں میں کھو گیا۔ میرے دل کی جلن ہزاروں کوس دور رام اور لچھمن کی طرح بن باس میں تھی اور سیتا کا خیال میری تسکین کے پردوں کو بھی پریشان نہ کرتا تھا۔ اس وقت میں دنیا کی

کلفتوں سے آزاد قحط سالی اور جنگ و جدل کے خیالات سے بری
قدرت کے پراسرار کرشموں سے متاثر خود قدرت کا ایک جز ہو کر
کائنات پر حاوی ہو چکا تھا۔ میں اس جذبہ میں ڈوبا ہاتھ کمر کے
پیچھے باندھے اس طرح آہستہ آہستہ چل رہا تھا جیسے بادِ نسیم کسی
محبوب کے چہرے کو چومتی ہوئی چلتی ہے کہ پیچھے سے کسی کی آواز
ایسے آئی جیسے کوئی عاجزی اور منت سے کہہ رہا ہو "کیا کہا اے خدا"
آواز میرے کانوں میں غالباً پہلے بھی آئی تھی لیکن میں کچھ ایسا محوِ
تخیل تھا کہ نہ سُنی۔ جب مجھے رفتہ رفتہ آواز کا احساس ہوا تو میرے
رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کسی کے پیروں کی چاپ نہ سنائی دیتی تھی
لیکن آواز ہر ہر منٹ پر متواتر آرہی تھی اور قریب تر اور بلند ہوتی
جاتی تھی میں نے مڑکر دیکھنے کی کوشش کی لیکن ڈر کے مارے میری
گردن نے جنبش نہ کھائی۔ اتنے میں ایسا معلوم ہوا کہ کوئی بالکل میرے
برابر ہی کہہ رہا ہے "کیا کہا اے خدا؟" میں نے جو مڑکر دیکھا تو پادری صاحب

ایک سائیکل پر دکھائی دیئے۔ شاید وہ بھی اپنے خیالات میں ایسے منہمک تھے کہ اُنھوں نے بھی مجھ کو نہ دیکھا۔ میں نے کہا:

"پادری صاحب خیر تو ہے؟ آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں"

وہ سائیکل سے اتر پڑے لیکن اُن کا چہرہ چھپکلی کے پیٹ کی طرح زرد اور بھیانک معلوم ہوتا تھا۔ کچھ منٹ تو وہ ساکت کھڑے رہے جیسے اُن کی روح سلب کی جا رہی ہو۔ میرا خوف بڑھ گیا اور میں نے گھبرا کے کہا:

"آخر کچھ تو فرمایئے کیا آپ کی طبیعت ناساز ہے؟"

پھر اُنھوں نے اپنی زبان سے اپنے اوپر کے ہونٹ کو بمشکل تر کیا اور جذباتی کیفیت میں بولے:

"جب میں سائیکل کے ہینڈل پر ہیر بار کے ایک خاص جگہ لاتا ہوں تو خدا مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن جب میں سننے کی کوشش کرتا ہوں تو میرا پیر آگے بڑھ جاتا ہے اور مجھے کچھ بھی سنائی نہیں دیتا۔"

اُن کی آواز سُن کے میری جان میں جان آئی لیکن اُن کی بات پر پہلے تو مجھے تعجب ہوا پھر ہنسی آنے لگی میں نے کہا:

"تو پھر آپ پیر روک کیوں نہیں لیتے؟ تاکہ خدا کی آواز آپ کے کانوں تک پہنچ جائے۔"

"یہی تو عجیب بات ہے" وہ بولے کہ آواز صرف اُسی وقت آتی ہے جب ایک جگہ پورا ہو جاتا ہے اور اگر میں پیر بار نے چھوڑ دیتا ہوں تو آواز بھی آنی بند ہو جاتی ہے، اور اُسی وقت آتی ہے جب میرا پیر ایک خاص مقام پر ہوتا ہے لیکن خدا اپنی بات پوری کرنے ہی نہیں پاتا کہ میرا پیر آگے بڑھ جاتا ہے اور میں آواز نہیں سُن سکتا۔" اور یہ کہہ کر وہ عالمِ بالا کی طرف مخاطب ہو گئے: "اے روح القدس تو آ اور میرے اندر سما جا تاکہ ہر راز مجھ پر عیاں ہو جائے، کیونکہ میں اپنی موت مر رہا ہوں اور اُن کی موت جو میرے بعد آنے والے ہیں۔"

اس واسطے کہ تو میرا باپ ہے اور میں تیرا بیٹا . . . "

میرے جی میں آئی کہ پوچھوں پھر روح القدس کیا ہے؟ لیکن پادری صاحب کے چہرے پر کچھ ایسی کیفیت تھی کہ میری زبان بند ہو گئی ۔ اس پر سرمئی بادلوں کی زردی پھیل چکی تھی، آنکھیں اوپر چڑھ گئی تھیں اور خشک داڑھی پر آنسوؤں کی بوندیں اس طرح گر رہی تھیں جیسے کھرل پر پانی کے قطرے سائیکل ان کے جسم سے ٹکی ہوئی تھی اور ان کے ہاتھ دعا میں جڑے ہوئے تھے ۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ اب میرے گلے میں پھانسی کی طرح پڑ جائیں گے ۔ اس وقت وہ ہاتھ کسی زندہ انسان کے ہاتھ نہ تھے بلکہ موت کے ڈراؤنے اور آہنی ہاتھ معلوم ہوتے تھے لیکن دعا ختم کرتے ہی وہ سائیکل پر بیٹھ قدم مارتے ہوئے رات کی تاریکی میں کھو گئے ۔

جب میں گھر آیا تو پادری صاحب کے خیال سے

متعجب اور پریشان ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے کمرہ میں بجلی کی روشنی کا
احساس باقی نہ رہا۔ مجھے یہ بھی احساس نہ ہوا کہ میں اپنے مکان کے
کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں۔ کسی چیز نے بھی میرے خیالات کو منتشر نہ
کیا۔ صرف کبھی کبھی کھڑکیوں میں سے بجلی کہیں دور کسی اور دنیا میں
چمکتی دکھائی دیتی اور ہوا کے سناٹے سے خاموشی اور بڑھ جاتی۔
نہ جانے کتنی دیر میں ان خیالات میں کھویا بیٹھا رہا کہ یکایک
جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو ہوش آیا۔ لیکن جب میں نے ٹیلیفون کو
کان سے لگایا اُس وقت بھی میں اپنے تخیل کی دُنیا میں کھویا
ہوا تھا۔ دوسرے کسی نے مجھ کو پوچھا۔ آواز کچھ ایسی عجیب اور غیر
دُنیاوی تھی کہ میرے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ اُس میں ایک آواز
بازگشت کی سی گونج تھی جو لہروں کی طرح پھیلتی جاتی تھی اور
بجائے ختم ہونے کے اور پھر پیدا کرتی ہوئی روح کی پرتوں
سے ٹکراتی تھی۔ میں نے پوچھا کون ہے؟ تو کچھ ایسا جواب ملا کہ میرا



1964 ж.

اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ ضرور کچھ غلطی ہو گئی ہے اور میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا:

"کون؟ کون بات کر رہا ہے؟"

اُدھر سے پھر وہی گونجتی ہوئی آواز کان میں آئی:

"میں خدا بول رہا ہوں"

چونکا تو میرے جسم میں خون نہ تھا میں اس طرح کانپنے لگا جیسے باری کا بخار چڑھ رہا ہو۔ ٹیلیفون میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اُس کے گرنے نے مجھے چونکا دیا۔ کیا میں خواب دیکھ رہا تھا؟ لیکن پھر دل ہی دل میں کہا کہ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مجھ جیسے ناچیز گنہگار سے پروردگارِ عالم بات کرے ضرور مجھے دھوکا ہوا ہے اور جی کڑا کر کے میں نے پھر ٹیلیفون کان سے لگایا اور ہمت کر کے کہا:

"ذرا اپنا اسمِ گرامی پھر ارشاد فرمائیے۔ میں سمجھا نہیں ......"

بڑی دیر تک میں ٹیلیفون سے کان لگائے رہا۔ اُدھر سے

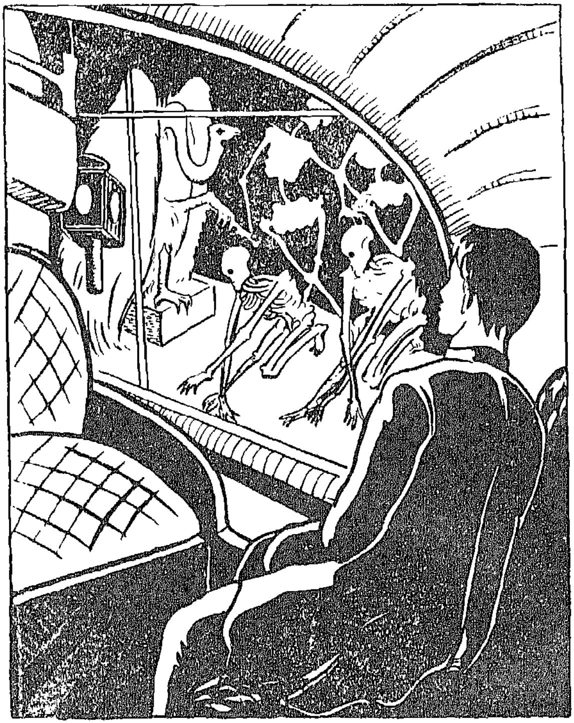
کوئی جواب نہ ملا۔ صرف ایک خاموشی جو اندھیری راتوں کی سیاہی
سے زیادہ گہری اور بادلوں سے زیادہ گھنی تھی میرے کانوں میں
آئی اور میں اتنا خوف زدہ ہوگیا کہ ضعف سے کرسی پر بیٹھ گیا
اور آنکھیں بند کرلیں۔ میرے جسم میں تھرتھراہٹ اس طرح دوڑ
رہی تھی جیسے اناج کی کوٹھری میں چوہے ....

جب ذرا طبیعت ٹھہری تو میں نے گاڑی جتوائی۔ جب
میں کمرے سے نکلا تو بجلی یکبارگی چمکی اور میری نگاہ درختوں کے
سوکھے ہوئے ٹھنٹوں پر پڑی جو رات کی سیاہی میں ایک ڈراؤنے
خواب کی طرح ہاتھ آسمان کی طرف پھیلائے کھڑے تھے۔ ایک
تنے پر ایک الو ساکن بیٹھا ہوا تھا جیسے کاٹ کا بنا کر رکھ دیا
ہو۔ پھر ایک ہی لمحہ میں تاریکی پھر چھا گئی اور یہ سان و گمان بھی نہ
ہوتا تھا کہ وہاں سوائے رات کے کوئی اور شئے بھی موجود ہے۔ جب
میں گاڑی میں قدم رکھ رہا تھا تو گھنگھرو کی آواز میرے کانوں

میں آئی، لیکن گھوڑے چلے، اور میں ذرا ہی دیر میں اس آواز کو بھول گیا۔

گاڑی تیزی سے چلتی رہی۔ اب وہ شہر کی ایک تنگ اور پتھریلی سڑک پر گزر رہی تھی اور اُس کے پہیوں کی آواز ایک آبشار کی طرح دھائیں دھائیں مسلسل آ رہی تھی۔ جب گاڑی نے ایک ہچکولا لیا تو میں سنبھل کر ہو بیٹھا۔ گاڑی سے منہ نکال کر دیکھا۔ ہم ایک عظیم الشان دکان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اُن کی بڑی بڑی کھڑکیوں میں قدِ آدم شیشے جڑے ہوئے تھے اور وہ روشنی سے جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ میں ہر چیز کا جائزہ بھی نہ لینے پایا تھا کہ میری آنکھیں ایک کھڑکی پر جمی کی جمی رہ گئیں اُس میں ایک شخص کھڑا تھا جس کی ٹانگیں پتلی اور ایک آدمی کی ٹانگوں کے برابر لمبی تھیں کائیں کائیں پڑیاں بیچ رہا تھا اور لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے انہیں اپنی باہیبت چیخ سے اس طرح

اُچھالتا تھا کہ کٹ پتلی کے ناچ کا گمان پیدا ہو جاتا تھا۔ میں اس عجیب و غریب تماشے کو اس انہماک سے دیکھنے لگا کہ مجھے معلوم ہوا کہ میں تو بس ایک ہڈی ہوں۔ اتنے میں کوّے نے میری طرف دیکھا اور اپنی چونچ بڑھائی۔ وہ مجھے بھی ایک ہڈی سمجھ کر اُٹھانے ہی والا تھا کہ گاڑی آگے بڑھ کے دوسری کھڑکی کے سامنے رُک گئی۔ اُس میں ایک گدھ انسانوں کے ہاتھوں، پیروں، اُنگلیوں اور سروں کو اس طرح نچا رہا تھا کہ ہوا میں تو وہ ایک کل کی طرح چلتا ہوا آدمی دکھائی دیتے تھے، لیکن جب فرش پر گرتے تو ہر ہر عضو الگ الگ ہو جاتا جیسے پانی کی چادر نہروں سے گر کر سائن پھاؤں میں رنگ برنگ کے نقشے بناتی ہے اور پھر پانی میں مل جاتی ہے۔ پھر ایک ایک کر کے ہاتھ پیر اور سر غائب ہو گئے۔ گدھ پر پھیلائے دُم کے سہارے سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندہ نہیں ہے بلکہ کسی ٹیکسی ڈرمسٹ کا اشتہار ہے۔ اس نے مجھے دیکھا تو اس کی



آنکھیں چمک اُٹھیں اور خوشی کی مسکراہٹ اُس کے منہ پر پھیل
گئی۔ اپنی زبان سے چونچ صاف کر کے اُس نے اپنی گھناؤنی
سُرخ گردن میری طرف بڑھائی۔ اُس کے سر کے سفید پَر دیئیں کانٹوں
کی طرح کھڑے ہو گئے اور جوں جوں گردن میری طرف آتی گئی سہمی سی
میرا خون خشک ہوتا گیا اور اُس کے چہرے کی مسکراہٹ نفرت
سے بدلتی گئی میں گاڑی کے ایک کونے میں دبک گیا۔
اب گدھ کی گردن کھڑکی کے قریب آگئی۔ اندر منہ ڈال کے
اُس نے میرا سہما ہوا چہرہ دیکھا اور ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔
میری گھگھی بندھ گئی، لیکن اسی وقت ایک ہچکولے کر گاڑی بھی
آگے بڑھ گئی میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے اور پسینہ
میرے جسم سے بارش کی طرح بہہ رہا تھا ہر طرف سوائے تاریکی کے
کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ کوچوان گھوڑوں کو زور زور سے مار رہا تھا
اور وہ ہوا میں سرپٹ اُڑے جا رہے تھے جب میرا سانس درست

ہوا تو میں نے چلا کر کہا:

"یہ کہاں لیے جا رہے ہو؟ گھر واپس چلو!"

"ذرا منہ سنبھال کر بولو۔ جانتے نہیں ہو کس سے باتیں کر رہے ہو؟"

آواز میرے کوچوان کی نہ تھی لیکن میں نے جانا کہ شاید وہ آج زیادہ پی گیا ہے، اور میں نے ڈانٹ کر کہا:

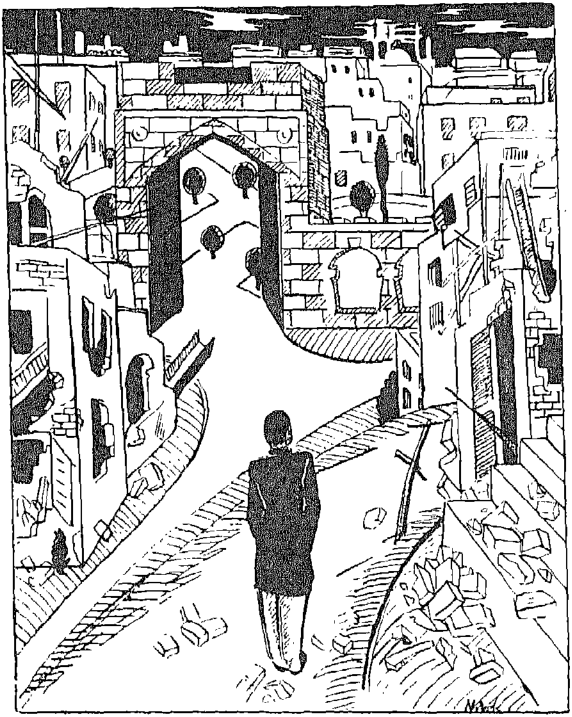
"یہ کیا بک بک لگائی ہے۔ اوسان ٹھکانے کر دوں گا؟"

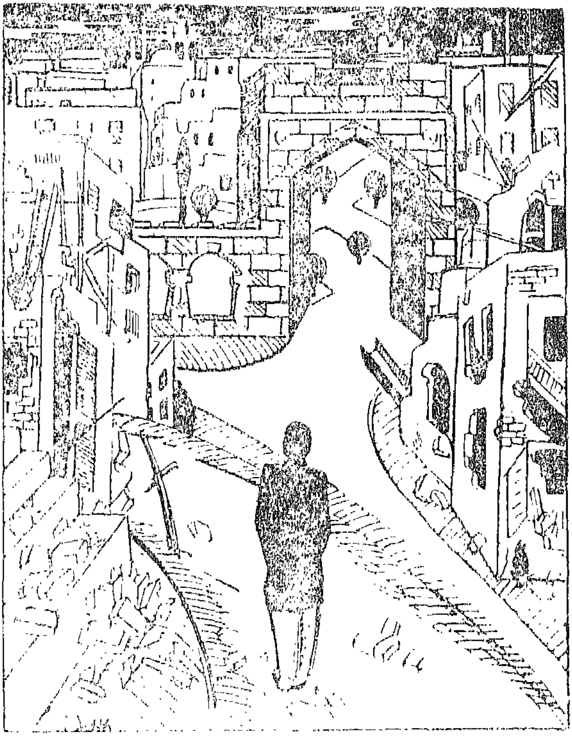
گاڑی یکایک رک گئی اور کوچوان نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کو دیکھتے ہی میرے حواس باختہ ہو گئے کیونکہ وہ میرا کوچوان نہ تھا بلکہ ایک ڈراؤنی شکل کا اجنبی گاڑی ہانک رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں باگیں تھیں اور دوسرے میں چابک جس کے سرے پر گیہوں کی ایک بال بندھی ہوئی تھی اور اس کی رسی ایک ہرے سانپ کا گمان پیدا کرتی تھی۔ اس کی سیاہ رنگت، گھنی داڑھی

رات کے آسمان پر لگی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے غیر انسانی چہرے
سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ازل اور ابد کے سب رازوں کو جانتا ہے۔ وہ
نہ تو اسے سمجھ سکتا ہے نہ مسرت اپنے مقصد سے بھٹک سکتی ہے۔ اس نے
ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھا۔ اس کی ایک آنکھ میں ایسی کشش تھی کہ میں
ہر چیز کو بھول گیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا یہاں تک کہ سوائے آنکھ
کے سب چیزیں تاریکی میں کھو گئیں۔ گدلی سفیدی میں پھوٹے
ابلے تھے جیسے داڑھی شیشے کے پیندے سے تیروں کو پیا ہو جو اس کے بھوری
صورت میں تراشا ہوا دانت دہن میں عقیق کا نگینہ تھا۔ میں اس کو اس طرح
گھورتا رہا جیسے آنکھ نے مجھے مست کر دیا ہو۔ یکایک مردک کی جگہ ایک
بڑھیا نظر آئی جس کے منہ پر بڑی ہزار جھریاں تھیں اور منہ
میں دانت تھے نہ پیٹ میں آنت۔ لیکن آنکھ نے پلک بھی نہ ماری
اور اسی طرح مجھے گرفتار کئے رہی۔ پھر اس کے رنگ اس طرح
غائب ہونے شروع ہوئے جیسے کوئی چیز نزدیک لا کے آہستہ

آہستہ دور کرتی جاتی ہے، اور آنکھ کی جگہ ایک پہاڑی غار کی عمیق سیاہی آگئی۔ آنکھ بند ہوئی اور غائب ہو گئی لیکن تاریکی اسی طرح قائم رہی۔ میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا اور ڈر نے مجھے اپنے پنجوں میں جکڑ لیا۔ میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے اور نہ تو میں ہل جل ہی سکتا تھا اور نہ آنکھیں ہی بند کر سکتا لیکن پھر ڈر ہی نے میرا ساتھ دیا۔ میرے اندر زندگی کی سب طاقتیں جاگ اٹھیں اور میں نے قوتِ ارادی کو جھنجوڑ کر اٹھایا۔ آنکھ اور بڑھیا اور سیاہی رات سی تاریکی میں کھو گئے پر آنکھ کے نشان متواتر بلبلوں کی طرح میرے احساس کی سطح پر بنتے اور پھوٹتے رہے یعنی اس وقت جب میں آنکھوں کے سمندر میں ڈوبنے والا تھا ہمت کر کے گاڑی کو دیکھا۔ نہ گاڑی تھی، نہ کوچوان نہ گھوڑے میں ایک دیوار کے سامنے اکیلا کھڑا تھا۔

دیوار ایک پہاڑی قلعہ کی تھی اور میں اسی پر اپنی منزل





مقصود کی طرف جا رہا تھا چلتے چلتے میں ایسے مقام پر پہونچا جہاں سے ایک اونچی دیوار شروع ہوتی تھی میں سیدھی دیوار کو چھوڑ کر اونچی دیوار پر ہو لیا۔ دو تین ہی قدم جانے کے بعد معلوم ہوا کہ دیوار ٹوٹ چکی ہے اور میں آگے نہیں جا سکتا۔ دیوار کے اس ذرا سے ٹکڑے پر میں تنِ تنہا، بے یار و مددگار کھڑا رہ گیا۔ نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہی مڑ سکتا تھا۔ یاس وحسرت اور بیچارگی نے مجھ کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ سارے عالم میں عشق ہی عشق تھا، ساری دنیا میں عیش کے شادیانے بج رہے تھے، پر جہاں میں کھڑا ہوا تھا اس جگہ نہ آدم تھا نہ آدم زاد، نہ بلبلیں ہی چہچہاتی تھیں نہ کسی جاندار کی آواز سنائی دیتی تھی۔ بلکہ سارے جہان کی تہمتیں اور سب صحراؤں کی وحشت میرا نوحہ گا رہی تھیں۔ پھر چار و ناچار میں نے طے کیا کہ نیچے ہی اترنے میں عافیت ہے۔ چڑھنا تو آسان تھا اترنا دشوار ثابت ہوا۔ جب میں ہاتھوں سے دیوار پکڑ کے نیچے اترنے کی کوشش

کر رہا تھا اُس وقت بلندی کے خیال اور گرنے کے ڈر سے آنکھوں
تلے اندھیرا آگیا۔ ہزاروں فٹ نیچے وادی کی تہہ میں ایک
ندی سوت کے ڈورے کی طرح بہہ رہی تھی لیکن وہ اتنی دور
تھی کہ پانی کی آواز بھی کانوں میں نہ آتی تھی اور بہت نیچے پہاڑوں
اور آسمان پر ایک کہر چھایا ہوا تھا اور درخت اور چٹانیں ایک
پرچھائیں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ میرا سر چکرا گیا۔ دنیا غبار
ہوگئی اور ایسا معلوم ہوا کہ اب دیوار ہاتھ سے چھوٹ جائے گی
میرا نہ گرنا ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔ پر ایک ہی لمحہ میں
خطرہ کا احساس جاتا رہا۔ مجھے یہ بھی خیال نہ رہا کہ میں کسی مصیبت
میں گرفتار ہو گیا تھا۔ میں دیوار پر اس طرح چلتا رہا جیسے وہ ایک
کشادہ سڑک رہی ہو۔

سامنے اُس عمارت کی محراب دکھائی دے رہی تھی جو
میری منزلِ مقصود تھی، جہاں وہ مندر تھا جس کی تلاش میں میں

دنیا دنیا اور جنگل جنگل مارا مارا پھرتا تھا۔ مجھے اس کی دیواروں کا ہلکا بادامی رنگ صاف دکھائی دینے لگا اور وہ لکیر جہاں پچی کاری کی محراب بنی ہوئی تھی اور جہاں سے چونا جھڑ چکا تھا اور میں تیز تیز قدم رکھنے لگا۔ دیوار ایک چوڑی چھت سے آ کے مل گئی۔ میں نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ جس راستے سے میں گزر آیا تھا وہ پیچھے رہ گیا تھا۔

چھت پرانی اور چونے کی بنی ہوئی تھی اور اس کا رنگ دھوپ اور بارش اور وقت کے اثر سے کالا ہو چکا تھا، لیکن کہیں کہیں ہلکا رنگ جھلکتا تھا۔ چاروں طرف نیچی منڈیر تھی اور میں بے خوف و خطر اس کے دوسرے کونے تک چلتا گیا۔ لیکن چھت سے ملحق جو عمارتوں کا سلسلہ تھا کبھی کا گر چکا تھا اور آگے جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ مایوسی نے مجھ کو گھیر لیا۔ منزلِ مقصود تک پہونچنے کی کوئی امید نہ تھی۔

کود پڑنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ دونوں ہاتھ آگے
پھیلا کر میں ہوا میں کود پڑا۔ ایک زمانہ تھا کہ میں آسانی سے اُڑ
سکتا تھا۔ پر اب قویٰ اتنے بوجھل ہو گئے تھے کہ مجھ میں طاقت
پرواز بھی باقی نہ تھی۔ اپنے مضمحل جسم کو بمشکل سنبھالے میں قلعہ کے
نچلے حصّہ سے ہوتا ہوا آبادی کی طرف آیا۔ پہلی چیز جو نظر آئی وہ
شہر کے باہر مکانوں کے کھنڈرات تھے کچھ کی چھتیں بیٹھ چکی تھیں
اور زینے ملبے سے اَٹ گئے تھے۔ کچھ مٹی اور اینٹوں کے ڈھیر
دکھائی دیتے تھے۔ میں شاہی دروازہ سے شہر کے اندر داخل ہوا۔
سڑکیں صاف ستھری اور دھلی ہوئی تھیں لیکن ایک بھیانک خاموشی
ہر چیز پر چھائی ہوئی تھی میں مسجد جامع سے ہوتا ہوا گزرا۔ مجھے یقین تھا
کہ یہاں ضرور رونق ہو گی۔ لیکن ہر چیز سونی تھی ایسا معلوم ہوا کہ یہاں
کوئی بستا ہی نہیں ہے اور یہ جنّاتوں کی بستی ہے۔ وہ بازار اور کوچے
جن پر میرے قدم ہزاروں بار گونجے تھے اب غیر آباد نظر آتے

تھے۔ نہ کہیں آدمی کا پتہ چلتا تھا نہ آبادی کا نشان میں باغ سے
گزرتا ہوا حوضِ خاص پہونچا اور یہ سوچ کر کہ نہا ڈالوں اس کے تاریک
کمروں اور نیچی ہندوانی محرابوں سے گزرتا ہوا حوض تک آیا۔
کپڑے اُتار کے جب میں اُس کے کنارے آیا تو دیکھا کہ اُس میں
پانی کی ایک بوند بھی نہیں ہے۔ فرش صاف پڑا تھا اور چاروں
طرف پتھر کی اونچی دیواریں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں میں
اس قدر تھک گیا تھا کہ ایک کونے میں بیٹھ رہا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا
کہ میں اُن دیواروں، مقبروں اور کھنڈرات کا ایک جیتا جاگتا حصہ ہوں
اور وقت اور ارض و سماں کا تشخص جاتا رہا۔ میرا وجود غیر فانی بھی
تھا اور بے حقیقت بھی۔ جو کچھ بھی تھا اور نہ تھا میرے احساس سے
بیک وقت کمتر اور بالا تھا۔ میں اسی عالم میں بیٹھا ہوا تھا کہ ہوا
کے ایک جھونکے کے ساتھ لوگوں کی آوازیں آئیں۔ وہ کہیں
اوپر باتیں کر رہے تھے۔

"میں نے کہا یار، ذرا اِس چڑیا کو تو دیکھنا۔ لو، معلوم دے رہا ہے۔"

دوسرا بولا:

"کہہ تو ٹھیک رہے ہو۔ وہ اڑا۔ دیکھ رہے ہو پہلوان؟ ہوا میں ادھر لٹکا ہوا کس طرح یوں زمین کی طرف دیکھ دیکھ کے گائے جا رہا ہے جیسے پھلجھڑی چھوٹ رہی ہو۔"

اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک چڑیا کے چہچہانے کی آواز آئی، لیکن بہت باریک اور کہیں دور سے۔

"وہی ببول میں گھونسلا ہوگا۔ ابھی بیٹھے گا تو معلوم ہو جائے گا۔"

"تو بادشاہ پھر پکڑنے کی تدبیر کرنی چاہیے۔ آج کل لوے بڑی مشکل سے ہاتھ آتے ہیں۔"

"تو چلو ذری گھونسلے کا پتہ لگا لائیں۔ کیا صلاح ہے پہلوان؟"

"جو تجاوزِ یار میں آئے۔"

آوازیں بند ہو گئیں۔ شاید وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے تھے لیکن فوراً ہی ایک تھکی ہوئی سی آواز اُسی طرف سے آئی جہاں سے کرخندار بولے تھے۔

"کہا یہ مٹی دو۔"

اس کے بعد پیروں کی آواز آئی اور پھر مٹی گرنے کی۔

بڑی دیر تک میں دیوار سے سر ٹیکے خاموش بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میں جیتا ہوں یا مر گیا۔ اس غفلت کے عالم میں آوازیں پھر کانوں میں آنی شروع ہوئیں۔ یہ آوازیں انجان اور نئی تھیں اور اس طرح سنائی دیتی تھیں جیسے آس پاس کے گھروں کی دیواروں کے پیچھے سے آ رہی ہوں۔ پہلی آواز تیز اور شوخ تھی۔

"اے حضور آپ نے اور بھی سنا؟ آج ایک نئی بائی جی آئی ہیں۔"

"اماں کہاں" دوسری آواز سوتی ہوئی سی خمار آلود گتی تو اکو دیکھنا چاہیئے۔"

"آپ کی پائنتیوں ہیں حضور۔ ابھی تو خمار بھی نہیں اترا ہو لیکن اب بہت دیر نہیں ہو۔ کیوں بھئی رجن خاں کیا ابھی تک سو رہے ہو؟"

"نہیں تو حضور" تیسرے نے کہا "میں ذرا رجن بائی کا انتظار کر رہا۔"

"اچھا تو یوں کہو، ان کا نام رجن بائی ہو۔"

"اماں واہ، یہ بھی خوب کہی۔ اب تو دو دو رجن ہو گئے۔"

"واللہ نواب صاحب کیا بات کہی ہو آپ نے۔ ہا ہا ہا۔"

"تو بھئی رجن خاں کیا کہتے ہو؟"

"بس حضور کے حکم کی دیر ہو۔ کوئی ٹھمری کوئی غزل کوئی دادرا۔ ۔ ۔ ۔"

"اماں تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ یہ ہیں کون؟"

کیا پوچھتے ہیں حضور انھوں نے پیشہ کرنا چھوڑ دیا تھا بڑی پارسا ہو گئی تھیں۔ حافظ شیرازی کا کلام پڑھتی تھیں اور رام رام جپتی تھیں۔ پہ حضور تھیں بڑی چلبلی، اور گانے میں تو ان کا ثانی نہ تھا"۔

تو کبھی یہ تو ہمارے میر صاحب کے مطلب کی ہیں۔ اگر اُن کی بائی جی سے شادی کردا دی جائے تو کیا رہے؟"

"ہاہاہا۔ اے حضور کیا بات کہی ہے آپ نے واللہ" تیز اور شوخ آواز نے کہا اور ہنسی اس طرح گونجی جیسے ستار پر دھرپت کی گت۔

"دیکھئے نواب صاحب میں آپ سے بارہا کہہ چکا ہوں اتنا مذاق اچھا نہیں ہوتا" ایک مایوس آواز جیسے کسی نامراد عاشق کی رہی ہو ہوا میں ٹکراتی ہوئی آئی۔ "میں غریب سہی لیکن شریف ہوں۔ مجھے اپنی بیوی سے محبت تھی"۔

"ہاں چھوڑو بھی محبت کو حسن سے کیا واسطہ؟ ایک شخص کی آواز ٹھہری دوسرا اعضا کا تناسب ہے"

"تو پھر دونوں میں فرق کیا ہوا جناب؟ ایک اور آواز متانت سے بولی" ایک دل کی آواز ہے دوسرا عناصر کا اعتدال"

"ہاں یہی تو ہم نے بھی کہا تھا۔ محبت حسن کا پردہ ہے۔۔۔۔"

"غلط" اسی آواز نے پھر کہا "پردہ نہیں ہے تو محبت حسن ہے اور حسن حقیقت"

"ہاں تم تو فلسفہ بگھارنے لگے۔ اگر دال بگھارتے تو عرض احوال اچھا ہوتا" نواب صاحب نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ایک قہقہہ کی آواز سارے میں گونج اٹھی۔

ابھی ہنسی رکنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک خوش گلو عورت کی آواز سُریلے راگ میں گاتی نسیم بہار کی طرح اٹکھیلیاں کرتی ہوئی سنائی دی:

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم

ای بے خبر ز لذت شرب مدام ما

ہر طرف سے واہ واہ اور سبحان اللہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ جب آوازیں بند ہوئیں تو نواب صاحب نے دریافت کیا:

"اماں یہ کون ہیں؟"

"کیوں بھئی رجن خاں یہ تو تمہارا کام معلوم ہوتا ہے"

"حضور یہی تو ہیں۔ کیا عرض کیا تھا میں نے!"

"بھئی واہ۔ جزاک اللہ خدا ان کی عمر دراز کرے۔ ہر ہر لفظ کو کس خوبصورتی سے ادا کیا۔ جب گلا ایسا پایا ہے تو صورت تو کیا ہی پائی ہوگی!"

"حضور، ٹکڑی سی تارا سا تھا چاند۔ بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں ------"

"ہاں تو پھر دیکھنے کی تدبیر کرنی چاہیے۔ کیا پھر سو گئے؟"

"اسے حضور کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ میں تو محو تماشا ہوں

وہ دیکھیے کس ادا سے انگڑائی لیتی ہوئی اٹھ رہی ہیں۔"

"بھئی ہمیں تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

"آپ کی آنکھوں میں نا حضور۔ ذرا اٹھئے تو دیکھیے۔"

اتنے میں کسی دل جلے کی درد بھری آواز آئی:

فتنہ انگیز شود کاکل مشکیں بہ کشائے

تاب زنجیر ندارد دلِ دیوانۂ ما

"ہاں خیر تو ہے؟ یہ تو میاں مجنوں جاگ اٹھے۔ وہی ہیں نا؟"

"بجا فرمایا آپ نے حضور۔ یہ سب رحمن بابا کا فیض ہے۔

وہ سنئے پھر کچھ کہنے والی ہیں۔"

بے حجابانہ درآ از در کاشانۂ ما

کہ کسے نیست بجز درد تو در خانۂ ما۔۔۔۔

مجنوں نے آہ بھری، نواب صاحب نے سبحان اللہ

کا نعرہ لگایا اور ہر سمت سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔

"ہاں اب ہم سے صبر نہیں ہو سکتا"

"حضور کے حکم کی دیر ہے" رحمن خاں نے کہا۔

"لیکن ابھی جیب تو خالی ہے میں نے کہا سن رہے ہو، یا

بالکل ہی لوٹ ہو گئے؟"

"ارے حضور آپ کے ہوتے کہیں ایسی بھی کم کی گستاخی ہو سکتی

ہے؟ رہا زر نقد کا تو آخر سیٹھ جی کس لیے ہیں؟ جتنا آپ فرمائیں گے ابھی

ابھی حاضر ہو جائے گا۔ حضور کا اقبال سلامت چاہیئے۔ وہ

دیکھئے تو سیٹھ جی آ گئے کس ادا سے کھاتا بغل میں دبائے تو ند سہلاتے

ہوئے دکان کی طرف چلے ہیں"

"تو ابھی روکو انہیں۔ تم بھی کیا غضب کر رہے ہو"

"کیا مجھ سے کہا کچھ آپ نے؟" سیٹھ جی ٹھٹک کر بولے۔

"اماں چپکے کیوں ہو گئے؟ کہو نا ان سے دس ہزار کی ضرورت ہے" نواب صاحب نے دھیمی آواز میں کہا۔ لیکن سیٹھ جی خود ہی بول اٹھے:

"دیکھئے نواب صاحب پہلے بقایا قرضہ اتار دیجئے۔ ابھی سود بھی کوئی ڈیڑھ لاکھ چڑھ گیا ہے۔ اگر حساب بیباق نہ ہوا تو پولیس میں عرضداشت کر دوں گا...."

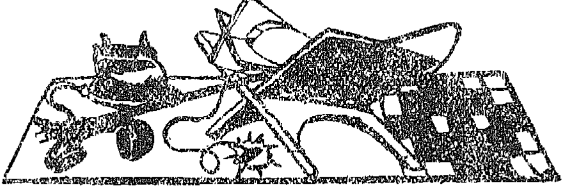
"اماں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ تمہارا پائی پائی کا حساب ہو جائے گا۔ لیکن اس وقت ہمیں روپیہ کی اشد ضرورت ہے...."

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہر طرف سے غل شور ہوا۔ طرح طرح کی آوازیں آئیں کوئی چلاتا:

"مار ڈالا" کوئی کہتا "چڑیل ہے، یہاں کس نے آنے دیا مردار کو" ایک عورت کی آواز آئی "میں بھی تو دیکھوں نا بکار کو جس نے میرے شوہر کو اسی نے برباد کیا تھا" ایسا معلوم ہوا بھیڑ لگ گئی ہے۔ کان پڑی

آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ اتنے میں گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں
اور ایک ڈراؤنی حاکمانہ آواز آئی "مار دو سالوں کو۔ کیا دیکھتا ہے
منگل خاں چڑھا دے گھوڑا، بدل سنگھ" پھر ایک واویلا کا شور ہوا
لوگوں کے گرنے کی آوازیں آئیں۔ پھر وہی حاکمانہ آواز سنائی دی۔
"نہیں ہٹنے سسرے تو چلاؤ گولی! کمپنی فائر!" توپوں کے چلنے کا
شور ہوا، پھر یکایک سناٹا چھا گیا، جیسے وہاں کوئی بھی نہ تھا۔
خاموشی یکایک معلوم ہونے لگی، اور میں گھر کی طرف چل دیا۔
تاریکی ہر سمت پھیل چکی تھی۔ رات کا دور دورہ تھا لیکن جا بجا
شعلے بھڑک رہے تھے۔ اور دور افق کی طرف لوٹتے ہوئے
ہوائی جہازوں کی بھنبھناتی ہوئی آواز کان میں آ رہی تھی۔ جیسے
ہی اپنے محلہ میں پہونچا تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں شدید بمباری
ہوئی ہے کسی عمارت کا بھی نام نشان باقی نہ رہا تھا۔ میرا دل دھک سا
سے ہو گیا۔ اپنی مایوسی کو سینہ سے لگائے حیران و پریشان اینٹوں

اور پتھروں کے ڈھیر پر چڑھتا چلا گیا۔ دور دور جدھر نگاہ اُٹھتی تھی
تباہی و بربادی دکھائی دیتی تھی۔ آس پاس کی عمارتیں اور فیکٹریاں
ابھی تک جل رہی تھیں اور اُن میں سے سُرخ سبز نیلی اور رنگ
برنگ کی لپٹیں اٹھ اُٹھ کر آسمان اور زمین کو قوس وقزح کے
رنگوں میں رنگے دیتی تھیں۔ یکایک میری نگاہ اپنے احاطے
کے درخت پر پڑی۔ وہ صحیح سالم اُسی طرح کھڑا ہوا تھا اور ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ وہ درخت نہیں ہے بلکہ بھیروں تانڈو کے لئے ہاتھ
اُٹھائے مست رقص و سرود ہے۔ میرے دل میں نفرت کی آگ بھڑک
اُٹھی لیکن اُس کے اور میرے درمیان ملبے اور آگ کا پہاڑ تھا اور
میں اُس تک نہ پہونچ سکتا تھا۔ میں بھی اپنی جگہ غرور سے سر اونچا
کئے اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے میں ہی ارض و سماں کا مالک ہوں۔ اور
میرے چاروں طرف ہوا اور شعلوں نے موسیقی کا جال بن لیا بقیہ صفحہ ۱۳۰



پیش لفظ

آرٹ سیاست اور زندگی

Art Politics and human Rifa

ہر مصنف اور خاص طور پر ہر تخلیقی مصنف، کی تصانیف پر اُس کی روزمرہ کی زندگی اور بدلتے ہوئے حالات کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ یہ حالات نہ صرف کاروبارِ معاش کی دشواریوں، کھانے پینے کی ضروریات وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ دماغی جدوجہد اور جذباتی زندگی سے بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ دراصل یہ سب متعلقہ چیزیں تخیل میں خلط ملط ہوکر ایک خاص صورت اختیار کر لیتی ہیں اور آرٹ کی حیثیت سے ظاہر ہوتی ہیں۔ لیکن زمانہ جدید کے تنقید نگاروں کی طرح اس اثر کے بیان میں نہ تو مبالغہ سے کام لینا چاہیے اور نہ اس کو موڑ

فوٹو گرافی بیان کرنا چاہیے، حالانکہ اس کو حذف کرنا بھی حقیقت سے گریز کرنا ہوگا۔

تخیلی حقیقت ہماری زندگی کی خارجی حقیقتوں سے اس قدر گہرا تعلق رکھتی ہے کہ اس کو دراصل دوسرے کا جزو لاینفک سمجھنا چاہیے۔ تخیل زندگی کی حقیقتوں کو بھلا کر محض ہواؤں میں پرواز نہیں کرتا۔ درحقیقت وہ خارجی اصلیت ہی سے طاقتِ پرواز حاصل کرتا ہے۔ جس طرح کہ خوابوں میں زندگی کی حقیقتیں اپنی شکل بدل سکتی ہیں اور دماغ پر اپنے رنگین عکس ڈالتی ہیں، اسی طرح وہ تخیل میں سے ہوتی ہوئی نئے رنگ اور روپ اختیار کرتی، کبھی چھوٹی، گہری اور واضح ہوتی ہوئی دوسروں تک پہنچتی اور ان کے دل اور دماغوں کو تقویت بخشتی ہیں۔ تخیل بیکار چیزوں کو علیحدہ اور حقیقی جذبات کو صاف کر کے اصلیت کے جوہر میں پیش کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مختلف چیزوں کی مشابہتوں کو لے کر ایک دلکش طریقہ سے مع آب و تاب اور ان کی

شدت کے پیش کرتا ہے ایک تخلیقی تصنیف اور اخبار نویسی میں
یہی فرق ہے کہ تخلیق میں تخیل کا ہاتھ ہوتا ہے جو اس کو آرٹ کا درجہ
بخش دیتا ہے اور اخبار نویسی یا رپورٹنگ تخیل سے پاک ہوتی ہے
اور زندگی کو بعینہٖ پیش کرتی ہے اور جمالیاتی خوشی بخشنے سے
قاصر رہتی ہے۔

ابھی تک تصنیف اور تخلیقی تصنیف کے فرق پر غور نہیں کیا
گیا ہے، نہ اسی بات پر ٹھنڈے دل سے توجہ کی گئی ہے کہ تصنیف
پر زندگی کے جدوجہد کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پچھلے
دس برس میں زندگی کی خارجی حقیقتوں پر بہت زور دیا گیا ہے
لیکن کسی نے آرٹ اور تخلیق کے مسئلوں کا غور و فکر سے مطالعہ نہیں
کیا۔ دراصل ہر عمدہ آرٹ زندگی کی حقیقتوں سے تعلق رکھتا ہے
لیکن اس کی تخلیق میں بہت سے ایسے جز شامل ہوتے ہیں جنکو
ہر شخص آسانی سے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے

سکے لئے خاص دماغی نشتروں اور پھیلا دینے اور سمیٹنے والے آلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

کسی چیز کو بجنسہٖ بیان کر دینا رپورٹنگ ہے۔ اس کے پوشیدہ جذبہ اور اثر کو دوسروں تک پہنچانا تخلیقی عمل ہے۔ کوئی چیز کسی ایک عنصر سے نہیں بنتی اُس کے اندر اور بہت سے عنصر شامل ہوتے ہیں۔ وہ بذات خود وجود میں نہیں آتی بلکہ وجہ و سبب کا نتیجہ ہوتی ہے، اور نہ وہ معلق اور ایک ہی لمحہ میں قائم رہ سکتی ہے اُس کے اندر ماضی اور مستقبل، ازل اور ابد، زیست و موت بھی شامل ہوتے ہیں۔ پھر وہ چیز نہ صرف اپنی بلکہ اپنے تمام جنس کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ آرٹ ایک چیز کے سب پہلوؤں کو مدِنظر رکھتا ہے گو اس میں شک نہیں کہ وہ ان سب کو واضح نہیں کرتا لیکن ان سب پہلوؤں کا احساس آرٹ میں بیک وقت موجود ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کے کارنامے ایک ادنیٰ شخصیت کے اندر

ہونے اور تخیّل کی رنگین وادیوں سے گزرتے ہوئے ہم تک
پہنچتے ہیں اس لئے اُن میں کچھ تبدیلیاں — کچھ اضافہ اور کچھ
کمی — واقع ہو جاتی ہیں اگر ان سب کا توازن درست ہو
تو اس نئی صورت میں وہ چیز ہم پر گہرا اثر کرتی ہے، اور نہ صرف خود
متحرک ہوتی ہے بلکہ ہمارے اندر بھی حرکت پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ
آرٹ ایک استعجاب کی کیفیت اور ہمارے اندر ایسا لطیف
جذبہ پیدا کرتا ہے جس کا اثر تو محسوس کرتے ہیں لیکن اس کا تجزیہ
نہیں کر سکتے جس طرح ہم محبّت کے پیدا کئے ہوئے لطیف
جذبات کو محسوس کرتے ہیں۔

ایک چیز کے ایک ہی وقت میں مختلف پہلو کئی ہوتے
ہیں یعنی سطحی بنیادی، فانی اور غیر فانی، حقیقی اور غیر حقیقی جب
کوئی مصنف صرف سطحی اور فانی پہلوؤں سے واسطہ رکھتا ہے
تو تصنیف میں پائندگی نہیں آتی۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ کچھ عرصہ تک

پڑھنے والے بھی اُس کے صرف سطحی پہلوؤں کو دیکھتے ہیں، وہ
پڑھتے وقت اُس تصنیف کو پسند کریں اور قابل تحسین قرار دیں
لیکن وقتی فانی چیزوں کا حامل نہیں ہوتا اور موجودہ صورت
کے بدل جانے پر تصنیف کا اثر زائل ہوجاتا ہے اور اُس میں
حرکت پیدا کرنے کی طاقت باقی نہیں رہتی اور وہ بیجان
ہوجاتی ہے گو فوری طور پر تھوڑے عرصہ کے لیئے اُس میں جذبات
پر اثر کرنے کا مادّہ تھا اُسی طرح جیسے "گلابِ اُردو" یا ٹیگور کی وقت
کی نثری نظمیں پیدا کرتی تھیں۔

"ترقی پسند" ادب کے بیشتر نمونہ زندگی کے محض فوری اور
سطحی پہلو پیش کرتے رہے ہیں جو اس ہی کم عرصہ میں بے
حرکت ہوگئے۔ "ترقی پسند مصنفین" نے ایک قابل ستائش
سیاسی نصب العین اپنی تحریک کے ذریعہ پیش کیا لیکن وہ
تصنیف کو تخلیق کا درجہ نہ دے سکے۔ شاید اس کی بڑی وجہ

یہ رہی ہو کہ اُس کے بہت سے کارکن اور بانی مبانی ہماری زندگی کے اور اور اہم اور سیاسی مسئلوں میں گھر گئے اور ان کا لگاؤ ادب سے نہ رہا۔ اسی وجہ سے وہ غالباً ہمارے ادب کے تخلیقی پہلوؤں پر ویسی گہری نظر نہ ڈال سکے جو انہوں نے اُس کی خارجی حقیقتوں پر ڈالی تھی۔

سیاست کا مقصد ہمارے اندر قومی جذبات کو اُبھارنا اور سماجی ترقی کی ترغیب دلانا ہے۔ وہ اپنا اثر تجزیہ حقیقت نگاری اور مقرری کے ذریعہ پیدا کرتی ہے۔ آرٹ کا تعلق زندگی کے گہرے اور پوشیدہ احساسات سے ہے۔ وہ ہمارے جذبات کو جگا کر حسن کی ترغیب دلاتا ہے اور اس کا تعلق تخیل سے زبان اور تالو کی طرح ہے۔ تخلیقی تصنیف بھی زندگی کی کثیف، تکلیف دہ اور ڈراؤنی حقیقتوں سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کا مقصد محض فوری نہیں ہوتا۔ اُس کے پیش نظر نہ صرف زمانہ حال ہوتا ہے

بلکہ مستقبل بھی، نہ صرف اس کے ہمعصر بلکہ آنے والی نسلیں
بھی۔ اسی واسطے آرٹ کے لئے ایک مقرر کی طرح چیخ چیخ کے
کہنا کہ "اے بھائیو! زندگی بہت گندی اور تلخ ہے آؤ اس کو
بدل ڈالیں" اپنے مقصد کو رد کرکے اخبار نویسوں کی نقل کرنا
ہوگا، کیونکہ پھر آرٹ اور سیاست میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔
اس میں شک نہیں کہ آرٹ اور سیاست دونوں زندگی ہی
سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ایک زندگی کے مستقل اور ہمہ گیر
اثرات اور جذبات کو پیش کرتا ہے اور سیاست اس کے
بدلنے والے اور وقتی پہلوؤں کو اپنے فکر کا مقصد بناتی ہے
مثلاً اگر سیاست کھیتی باڑی کرنے کے مختلف اور بہتر طریقوں
کی ترغیب دلاتی ہے، یا زندگی کی اصلاح و درستی یا حکومت
کرنے کے بہترین طریقے سوچتی اور عمل میں لاتی ہے، تو آرٹ فصل
بونے اور کاٹنے یا زندگی کے اور مختلف جذبات سے تعلق

رکھتا ہے۔

کسان فصل بوتا اور کاٹتا ہے اور پھر کھلیان میں اناج بھر دینے کے بعد گاتا ناچتا اور اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ یہ دونوں حرکتیں ایک ہی چیز سے تعلق رکھتی ہیں یعنی فصل سے اور ایک ہی چیز سے پیدا ہوتی ہیں یعنی پیٹ بھرنے کی خواہش سے لیکن ایک کا تعلق اس کے عمل اور دوسری کا اس کے جذباتی پہلوؤں سے ہے لیکن جس طرح ہم ہل چلانے کے بجائے ٹریکٹر استعمال کرنے یا انفرادی طریقہ سے کھیتی باڑی کرنے کی جگہ مجموعی یا مساواتی طریقے کی ترغیب دلانے کو اور کھیتی باڑی کرنے کے کام یا اس ناچ گانے کو جو کھیت جوتنے اور بونے کے جذبات سے پیدا ہوتے ہیں ایک ہی چیز تصور نہیں کر سکتے ، اسی طرح ہم سیاسیات یا کھیتی باڑی کو آرٹ نہیں کہہ سکتے۔ آرٹ کا ضروری یا غیر

ضروری ہونا یا آرٹ کا کھیتی باڑی اور مزدوری کرنے کے
مقابلہ میں کمتر یا برتر ہونا بالکل دوسری بات ہے لیکن ان دونوں
کو ایک سمجھنا کج فہمی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آرٹ فرصت کی چیز ہے اور محنت مزدوری
کرنے والوں کو فرصت نہیں ہوتی۔ تو پھر اگر سیاست مزدوری
کرنے والوں کو فرصت نہیں دلاتی تو اس کا فرض کیا ہوا؟ اور اگر
سیاست مزدور پیشہ لوگوں کے دماغی اور ادبی معیار کو بلند کرنا نہیں
چاہتی تو اس میں اور سامراج میں فرق کیا رہا؟ ہر سوسائٹی اور ہر
قوم کا ہمیشہ نصب العین رہا ہے کہ وہ سوسائٹی کے افراد کے
معیار کو بلند کرے۔ اسی لئے ہر مہذب قوم اور دور میں آرٹ
کا پایہ بلند رہا ہے۔ مصر و چین۔ یونان اور روما سے لے کر
فرانس و ایران و ہندستان کے خوشحال زمانوں پر نظر ڈال جائیے
ہر جگہ آپ کو اس بات کا ثبوت ملے گا۔ اس میں شک نہیں کہ

ان ممالک میں ایک جماعت دوسری کی بدولت ترقی کرتی اور پروان چڑھتی تھی۔ اب سب جماعتوں کے ایک ہو کر ترقی کرنے کا زمانہ آرہا ہے۔ لیکن ترقی کا ثبوت اور انحصار ان کی مجموعی یعنی اقتصادی، معاشی، دماغی، ادبی اور تخلیقی ترقی پر ہوگا۔

یہ کہنا بے معنی ہے کہ آرٹ چونکہ محض فرصت کی چیز ہے اس لیے بیکار اور صرف ایک انیوقی کا خواب ہے، اور مزدور کو بس عمرانوں اور حسن کی لذتوں کی طرف لے جاتا ہے، یا یہ کہ مزدور کو اس پر وقت صرف کرنے کی فرصت نہیں

ہر شخص آرٹسٹ نہیں ہو سکتا لیکن جس طرح ایک شخص ہل بناتا ہے، دوسرا کھیت جوتتا ہے، تیسرا آٹا پیستا ہے، چوتھا ہوائی جہاز بناتا اور چلاتا ہے، یا ایک انجنیر ہوتا ہے، ایک پروفیسر ایک ڈاکٹر اور ایک عطار، اسی طرح ایک مصنف، ایک موسیقی داں ایک مصور، ایک نقشہ نگار اور ایک آرٹسٹ بھی ہو سکتا ہے۔ ان

سب کو بھی کام کرنے کی فرصت درکار ہے جس طرح مشین چلانے کے لئے فرصت ضروری ہے۔ جب ایک کسان دن بھر کھیت بو سکتا ہے تو ایک آرٹسٹ بھی اپنے آرٹ میں غرق رہ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھ ہی ساتھ اوروں کے لئے بھی تخلیق کرتا ہے جس طرح مزدور اور کسان اُس کے لئے اور کام کرتے ہیں۔ جب مزدور، کسان، انجینیر، پروفیسر اور ہوا باز کی فرصت کا وقت ہوتا ہے تو وہ آرٹسٹ کے کارناموں سے لطف حاصل کرتے ہیں جس طرح کہ آرٹسٹ ان سب کی بنائی ہوئی چیزوں سے مستفید ہوتا ہے۔

عمارت اور آرائش عمارت کا سوال گمراہ کرنے والا ہے۔ کیونکہ آرائش عمارت اور عمارت دونوں ایک ہی چیز کی پیداوار ہیں۔ کسان کھیت جوتتا اور بوتا ہے اور پھر گاتا ناچتا ہے۔ تو کیا ناچنا گانا پیٹ بھرنے کی خواہش اور خوشی کا اظہار نہیں؟ جس طرح

جو تنخواہ پانے سے پیٹ نہیں بھرتا۔ اسی طرح ناچ گانے سے بھی نہیں بھرتا۔ انسان کے جسم میں صرف پیٹ ہی نہیں ہے، دل و دماغ، اور ان میں جذبات اور حسیات بھی ہیں اور انہی کی بدولت انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے اور یہی ایک پست اور مہذب سوسائٹی میں تفریق کا باعث ہیں۔

فی زمانہ آرٹ کو گرانے اور فضول چیز تصور کرنے کا الزام سیاست، اور ایک خاص قسم کی سیاست کے سر ہے۔ میرا مقصد سیاست کے خلاف جہاد کرنا یا اس کے فوائد اور اس کی ضروریات سے درگزر کرنا نہیں۔ دراصل ہم کو صحیح سیاسی رہنمائی کی اشد ضرورت ہے جو موجودہ زمانہ اور حالات میں صرف ایک روشن خیال اور غیر جانبدارانہ جماعت ہی کر سکتی ہے۔ لیکن سیاست کا کام سماج کی درستی کرنا اور اس کو ترقی دینا ہے جس طرح

ایک طبیب کا کام انجن چلانا نہیں ہے اسی طرح سیاست داں کا کام آرٹ سے گر سکھانا نہیں۔ چنانچہ تخلیقی تصنیف اور آرٹ بھی صرف سیاست کا دامن پکڑ کر فلاح و بہبود کو نہیں چھو سکتے۔ پائندگی کے لئے اور چیزیں بھی درکار ہیں۔ سب سے اہم چیز حقیقت کے بنیادی اور غیرفانی پہلوؤں کو پیش کرنا ہے۔

رپورٹنگ کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ اخبار نویسی بھی لوگوں کو بیدار کرنے اور ان میں اعلیٰ قومی جذبات پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن ان کو تخلیقی آرٹ سمجھ لینا تہذیب اور کلچر کے معیار کو پست کرنا ہوگا۔ تخلیقی آرٹ ہمارے اندر ایک جمالیاتی جذبہ پیدا کرکے سکون بخشتا ہے اور زندگی کے جس پہلو پر بھی روشنی ڈالتا ہے چاہے وہ حیات کا روشن پہلو ہو یا تاریک ایک شعاع پیدا ہوتی ہے جو ہر شے کو اجاگر کر دیتی ہے۔

سیاست کا تعلق سماجی تحریک اور اقتصادی اور حکومت

کے پہلوؤں سے ہے۔ تخلیقی آرٹ کا تعلق انسان کے جذبات
اور حسیات سے ہے۔ آرٹ کا تعلق شخصیت اور کیرکٹر سے ہے۔
شخصیت وہ چیز ہے جو انسان میں اس کی روح اور دماغ کے
گہرے احساسات سے پیدا ہوتی ہے۔ کیرکٹر۔ روایات اور اخلاقی
تعلیم سے بنتا ہے۔ سیاسی تصنیف کردار کو محض ایک ڈھانچے
کی طرح کسی خاص جماعت یا خیالات کے نمونوں یعنی TYPES
کی حیثیت سے پیش کرتی ہے جو گوشت پوست کی جیتی جاگتی شکلیں
اختیار نہیں کر پاتے۔ اس کا دارومدار ایک ڈھرے پر ہے جس میں
کوئی اصولی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ ہر تصنیف ایک ہی
رنگ میں رنگی ہوئی اور ایک سانچہ میں ڈھلی ہوئی نکلتی ہے
جو کچھ فوری اثر تو پیدا کر دیتی ہے لیکن پھر ختم ہو جاتی ہے کیونکہ اس کا
مقصد صرف اتنا ہی ہوتا ہے، اور وہ ہم کو کوئی گہرا جمالیاتی سکون
نہیں بخش سکتی۔ مثلاً ایک سیاسی مصنف بنگال کے قحط کے سطحی

پہلوؤں پر غور کرے گا۔ اس واسطے کہ اُسے ایک فوری نتیجہ نکالنا اور سیاسی جوش پیدا کرنا ہے۔ وہ کم و بیش ان مسائل کو پیش نظر رکھے گا:

اسبابِ قحط، حکومت یا حاکم کا رویہ، امراء اور حکام کی بے رخی و سرد مہری، ساہوکاروں کا مصیبت زدوں کی حالت سے فائدہ اُٹھانا، بعض نیم حساس کھاتے پیتے لوگوں کا اُن کی حالت پر افسوس کرنا لیکن اوپری طریقہ سے، قحط کے مارے ہوؤں کی جاں کنی اور کرب کا نقشہ۔ اس کے برعکس ایک تخلیقی مصنف قحط کے ساتھ ہی ساتھ موت، زندگی اور موت کی جنگ، اور کرداروں کو بحیثیت انسانوں کے پیش کرے گا نہ کہ ایک سیاسی تحریک کی صورت میں۔ یہ اغلب ہے کہ وہ واقعات کے پیش آتے ہی ان کو آرٹ کی صورت میں نہ ڈھال سکے گا کیونکہ جب تک واقعات تجربہ بن کے ہمارے

اندر نہ سما جائیں اور ہمارے حیات کا جزو لاینفک نہ بن جائیں وہ کبھی آرٹ کی صورت نہیں اختیار کر سکتے۔ اس لئے ہمکو رپورٹنگ اور اخبار نویسی کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ ہماری زندگی میں اُن کی بھی مستقل جگہ ہو تاکہ وہ حکومت یا سماج کی بدعنوانیوں کی طرف توجہ دلاتے رہیں۔

آرٹ کے لئے NOSTALGIA یعنی اُس گہری خواہش اور چاہ کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمارے تن من میں سما جاتے جس طرح وطن سے دور گھر کی تڑپا دینے والی یاد۔ یا وہ جذبہ جو ہمارے اندر ایام گزشتہ کے لوٹ آنے کی خواہش پیدا کرتا ہے۔ ایک اخبار نویس واقعات کو اسی طرح پیش کر دیتا ہے جس طرح وہ ظہور میں آتے ہیں، ایک سیاسی مصنف بھی اُن کو صرف لوگوں کے جذبات کو بھڑکانے کا ذریعہ بناتا ہے اور اپنی تحریر کو پُراثر بنانے کے لئے اخبار نویس اور مقرر کی طرزوں کو

استعمال میں لاتا ہے۔ واقعات اس کی زندگی کے گہرے احساس کا
جزبن کر نہیں آتے، وہ اس کی زندگی کا ایسا تجربہ نہیں بنتے جو
اس کو بدل دے اور بھلائے نہ بھولے، جو اس کی شخصیت کا ایک جز
ہو جائے اور اس کے کیرکٹر کی ایک کڑی۔ وہ تو محض فوٹوگرافی کی
تصویریں ہوتی ہیں جن میں ایمائیت UNIVERSALITY
نہیں ہوتی اور حقیقت کو بجنسہ ہماری آنکھوں کے سامنے رکھ دیتی
ہیں۔ چونکہ وہ فضول اور بے کار چیزیں بھی ہمارے سامنے پیش
کر دیتی ہیں۔ اس لئے اکثر اوقات انسانی اصلیتیں کھو جاتی ہیں یا اُن پر
نگاہ کم پڑتی ہے اور ان کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ جب تک کہ تصنیف
زندگی کے غیر فانی جذبات اور پہلوؤں کو زندہ نہ کر دے وہ
آرٹ نہیں بن سکتی۔ آرٹ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک
تجربہ یا خیال ہم کو اپنے پنجوں میں اس طرح جکڑ لے کہ بغیر اُس کا
اظہار کئے ہوئے ہم کو چین نہ آئے، جس کے سوچنے کے دوران

تخیل اپنا کام کر کے اس کو ہر فضول چیز سے پاک اور دھو دھلا کر صاف ستھرا اور لاجواب کر دے۔ بعض سیاسی قسم کی تصنیفیں بھی آرٹ کا مرتبہ حاصل کر سکتی ہیں لیکن اسی وقت جب وہ فرقہ بندی کی حد سے گزر کر زندگی کے اہم اور گہرے مسائل سے تعلق رکھیں، اُن مسائل سے جو فوری نہیں بلکہ غیر فانی ہیں اور ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے یکساں اثر رکھیں، پر اس وقت میرا تعلق افسانوی آرٹ سے ہے۔

محبت اور نفرت، انسانیت اور حیوانیت، زندگی اور موت کے مسئلوں کو کس طرح تصنیف میں پیش کیا جا سکتا ہے؟ یہ چیزیں آنکھوں سے نظر نہیں آتیں، ہاتھوں سے چھوئی نہیں جا سکتیں۔ ہم تو صرف ان کے اثر سے واقف ہیں، اور اس سے بھی پوری طرح نہیں۔ جو کچھ بھی اثر جذبات پر ہوتا ہے ہم صرف محسوس کر سکتے ہیں۔ چنانچہ تصنیف میں بھی ہم صرف

اُن کے اثر کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے اُن جذبات
اور اُن شکلوں کو استعمال کرتے ہیں جن کو سب سمجھ سکیں۔ ہم
دنیا میں رہتے ہیں اور ہمارے گرد و پیش اور زمین و
آسمان پر وہ صورتیں اور چیزیں ہیں جنہیں گو ہماری عقل
تسلیم کر لیتی ہے لیکن پھر بھی ہم ان کو حیرت اور حسرت سے
دیکھتے ہیں۔ بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق ہم کو کچھ
صحیح علم نہیں۔ انسانی تجربہ میں وسعت بھی ہے اور تنگی بھی۔
تو کیا ہم ان چیزوں کے بارے میں لکھنے سے گریز کریں؟
اگر زندگی ایک حقیقت ہے تو کیا موت حقیقت نہیں؟ قحط اور
غلامی، بھوک اور افلاس کیا موت سے کم نہیں؟ کیا یہ ہم کو
موت کی آغوش میں نہیں لے جاتے؟ جب تک ہم
زندہ ہیں زندگی کے مسائل میں اُلجھے رہتے ہیں۔ جب
مر جائیں گے تو کون سی چیزیں ہم کو پریشان کریں گی؟

اس میں شک نہیں کہ موت بعد کی چیز ہی لیکن زندگی پر نظر رکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہی کہ موت اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہی۔

تصنیفی تخلیق انسانی تخلیق کی طرح جذبے، خوشی اور رنج سے بھری ہوتی ہی جیسی طرح ایک بچّہ اپنے وجود سے پہلے اپنے والدین کے ذہنوں میں محض ایک دھندلا سا خیال ہوتا ہی لیکن پھر دو اشیا کے ملنے پر ایک نئی صورت اور ہیئت اختیار کرکے احساسات و جذبات لئے ہوئے گوشت کے پتلے کی شکل میں نمودار ہوتا ہی، اسی طرح سے آرٹ بھی خارجی حقیقت اور تخیل سے مل کر ہمارے لئے زندگی کے رموز اور حیرت کا آئینہ بنتا ہی، اور اس میں زندگی کے وہ سب جذبات جھلکتے ہیں جو ہم کو متحیر و متعجب کرتے اور جمالیاتی سرور سے بھر دیتے ہیں۔

آرٹ بقول بیکن کے قدرت اور انسان کا میل ہے۔
قدرت میں سب اجزا موجود ہوتے ہیں اور ایک آرٹسٹ
اُن میں سے ضروری چیزوں کو چھانٹ کر اور یکجا کرکے ایک
ایسی چیز تیار کرتا ہے (چاہے وہ تصویر یا تصنیف یا موسیقی ہو)
جو انسان کے دماغ اور حسن کے جذبہ کو مطمئن کرکے خوشی بخشتی
ہے۔ یہ کام رپورٹنگ، اخبار نویسی یا سیاست انجام نہیں
دے سکتے۔ چنانچہ سیاست میں ڈوب جانے کی وجہ سے ترقی
پسندی نے ہمارے سامنے تخلیق دادبی ترقی کا کوئی گہرا معیار
پیش نہیں کیا۔ انکی اردو CONTRIBUTION غیر اضافی تھی۔ اُس نے
ہم کو صرف ماضی، اور ماضی قریب کے ادب کی تاریکی سے
نکلنے اور زندگی کے قریب آنے کی ترغیب دلائی۔ لیکن ہمکو
آگے نہ بڑھا سکی کیونکہ اُس کے نظریئے ادبی نقطہ نظر سے
محدود تھے۔ اس لئے ترقی پسندی کی تحریک صرف ایک

خاص سیاسی جماعت سے منسوب ہو کر رہ گئی اور تخلیقی مصنفوں اور آرٹسٹوں پر کوئی دیرپا اثر نہ کر سکی۔

زندگی اور موت و زیست کے مسئلے بہت وسیع ہیں اور ایک محدود حلقے میں بند نہیں کئے جا سکتے۔ زندگی کو محض ایک جماعت کے نقطۂ نظر سے کامل اور وسیع طور پر نہیں دیکھا جا سکتا اُسی طرح سے جس طرح ہم سارے عالم اور ارض و سماں کو صرف ایک نظارہ پر نگاہ جما کر نہیں سمجھ سکتے۔ ترقی کا مطلب آگے بڑھنا ہے۔ صرف ایک جگہ کھڑے ہو کر زندگی کو دیکھنا نہیں ہے آرٹ اور رپورٹنگ یا پروپیگنڈا میں بڑا فرق ہے۔ اب تک ہمارے ہاں اس حقیقت پر غور نہیں کیا گیا ہے۔

یہ مسائل اتنے سہل نہیں کہ کسی خاص خیالات کے پیمانے سے ناپے جا سکیں۔ ان کو سمجھنے کے لئے درد اور گہرے تجربے کی ضرورت ہے۔ محض مشاہدہ سے کام نہیں چل سکتا کیونکہ

مشاہدہ صرف ظاہر سے تعلق رکھتا ہے اور تجربے کے لئے باطن کے احساس کی ضرورت ہے۔

سیاست بدلتی رہتی ہے۔ ایک دور آتا ہے اور ایک دور جاتا ہے۔ لیکن زندگی اور آرٹ جو زندگی کے باطنی اور ہمہ گیر جذبات کو ظاہر کرتا ہے اُسی طرح قائم رہتے ہیں۔

انسانیت کا ابتدائی دور ختم ہو گیا لیکن نغمۂ سلیمانی، گیتا اور قول اللہ اُسی طرح اب بھی ہمارے دلوں کو سرور بخشتے ہیں۔ جاگیرداری نظام مٹ چکا لیکن قصۂ الف لیلیٰ ابھی تک ہماری زندگی کے پوشیدہ جذبات پر روشنی ڈالتا ہے۔ اسی طرح ہر دور اور زمانے کے ادبی کارنامے ابھی تک زندہ ہیں اور حیاتِ جاودانی رکھتے ہیں دورِ سرمایہ داری دم توڑ رہا ہے لیکن اس کے تخلیقی نمونے زندہ رہیں گے۔ اشتراکیت کی آمد آمد ہے

لیکن یہ بھی ایک دن ختم ہو جائے گی۔ مگر آرٹ اور زندگی کا دور دورہ اسی طرح قائم رہے گا۔ اس واسطے ہم آرٹ کو سیاسی کوزوں میں بند نہیں کر سکتے اور نہ ہم زندگی کی عظمت اور بڑائی کو کم کر سکتے ہیں۔

احمد علی کی دیگر تصانیف

قید خانہ

ہماری گلی

شعلے

انگارے

وغیرہ

وغیرہ

DATE	No.	DATE	No.